ادارہ

اسلام اور امریکی رویئے

پروفیسر جان پال ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مختلف علمی اداروں میں تاریخ اسلام کے استاد رہے ہیں۔ ان دنوں واشنگٹن ڈی-سی کی جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے "مرکز برائے مسیحی-مسلم تفہیم" (CENTER FOR MUSLIM - CHRISTIAN UNDERSTANDING) سے وابستہ ہیں۔ دنیائے اسلام میں حالیہ اسلامی بیداری کی لہر ان کی دلچسپی کے موضوعات میں سے ہے۔

واضح رہے کہ "مرکز برائے مسیحی - مسلم تفہیم" کے سربراہ معروف مصنف جان اسپوزیٹو ہیں۔ کویت کے ہفت روزہ "المجتمع" نے جان پال سے ایک انٹرویو لیا ہے۔ جس کا ترجمہ موقر معاصر "تکبیر" (کراچی) کے شکریے کے ساتھ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ مدیر

س: وہ کون سی طاقتیں ہیں جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مغرب اور اسلام کے مابین عداوت کو ہوا دیتی ہیں؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ امریکیوں کے ہاں حقیقت اسلام سے عدم واقفیت کا بڑا سبب معاملات کا فقدان ہے۔ بہت سے امریکیوں کا دنیائے اسلام کے مسلمانوں سے کوئی خاص رابطہ نہیں ہے' لہٰذا وہ ابلاغ اور معلومات کے عام ذرائع' نیز اسکولوں کالجوں وغیرہ میں دی جانے والی تعلیم پر انحصار کرتے ہیں۔ اس میں اہم عامل' معلومات کا نہ ہونا ہے' نہ کہ غلط معلومات کا مہیا کیا جانا۔ مثلاً" ایک امریکی یہ خبر پڑھتا ہے کہ "اسکاٹ لینڈ میں بچوں کو قتل کر دیا گیا" تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے سب باشندے دہشت گرد نہیں ہیں' اس لئے کہ اس نے اسکول میں اسکاٹ لینڈ کی تہذیب کے بارے میں پڑھا ہوتا ہے' نیز اسکاٹ لینڈ میں اس کے کئی دوست جاننے والے ہوتے ہیں۔ اکثر امریکیوں نے شیکسپیئر کے ڈارمے میں میکبتھ کے بارے میں پڑھا ہوتا ہے۔ یہ شخص اسکاٹ لینڈ کا گورنر تھا اور عوام کو قتل کرتا تھا' مگر تعلیم یافتہ امریکی اس ڈرامے میں اس گورنر کے کردار کو پڑھ کر کبھی یہ نہیں کہتا کہ اسکاٹ لینڈ کے سب باشندے قاتل ہیں' مگر اس کے برعکس جب امریکی ٹیلی وژن فلسطین میں حماس کی طرف سے کئے جانے والے دھماکے کی خبر

نشر کرتا ہے تو ایک امریکی اس خبر کے ذریعے پہلی دفعہ حماس تحریک کے بارے میں سنتا ہے' اس سے پہلے اسے حماس کے کردار کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اسے نہیں معلوم کہ حماس نے خیموں میں رہنے والے فلسطینیوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے؟ اس نے اسکول بنوانے اور رفاہ عامہ کے دیگر کاموں میں کس قدر حصہ لیا ہے۔ چنانچہ اپنی اس بے خبری کے سبب دھماکہ کی خبر سن کر وہ حماس اور تمام اسلامی تحریکوں کے مابین ایک منفی قسم کا ذہنی رابطہ قائم کرتا ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ تمام اسلامی تحریکیں ہی دہشت گرد ہیں۔ لہٰذا بات سازش کی نہیں' بات یہودی لابی کی نہیں' بات یہ ہے کہ امریکی پیش آمدہ امور کے پس منظر سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان تک پہنچنے والی اطلاعات منفی ہوتی ہیں' جنہیں ذرائع ابلاغ مسخ کرکے پیش کرتے ہیں۔ عربوں اور مسلمانوں کے بارے میں فلمیں بنانے والے انہیں اپنے ایک خاص رنگ میں رنگ کر سامنے لاتے ہیں۔

یاد رہے کہ میں یہاں کسی طاقت کی طرف سے ہونے والی سازش کا ذکر نہیں کر رہا' مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی تصویر کو بگاڑنے میں کچھ طاقتوں کا مفاد ہے۔ یہ لوگ مختلف محاذوں پر مختلف ذرائع ابلاغ سے سیاسی دائروں میں رابطہ رکھتے ہیں۔

ہمیں ان طاقتوں کے صرف بین الاقوامی تعلقات یا خارجی سیاست میں کردار کو ہی مدنظر نہیں رکھنا چاہئے' بلکہ معلوم ہونا چاہیے کہ داخلی پالیسیوں میں بھی ان طاقتوں کا عمل دخل ہوتا ہے' اندرونی لابیاں خارجی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

میں ایک مثال سے اپنی بات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا سکوں گا۔ جب مسیحی مشنری جماعتیں دنیا کی مسیحی اقلیتوں کی کامیابی کے لئے کام کرنا چاہتی ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ امریکی پشت پناہی کی خواہاں ہوتی ہیں تو وہ ایسے ممالک کے امور میں دلچسپی لیتی ہیں جو امریکہ کی نظر کرم سے محروم ہیں یا امریکہ کے معتوب ہیں جیسے سوڈان' ایران وغیرہ' تاکہ وہ ان ملکوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرکے امریکہ کی حمایت و سرپرستی حاصل کریں اور اس طرح ان ملکوں کی مسیحی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرسکیں۔ آپ نے دیکھا کہ اندرونی لابیاں کس طرح امریکہ کی خارجہ پالیسی پر اثر ڈالتی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ متشدد لابیاں ہیں' صیہونی لابیاں ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کے وجود سے فائدہ اٹھاکر یہودی - امریکی تعلقات سے اپنا الوسیدھا کرتی ہیں اور امریکہ کی حمایت حاصل کر لیتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ کے مسلم باشندے اسلام کی عمدہ تصویر کشی میں کسی حد تک مثبت

کردار ادا کررہے ہیں۔ مثلاً" انہوں نے امریکہ کو اس بات کا قائل کر لیا ہے کہ حجاب کے بارے میں فرانسیسی موقف غلط ہے' اس لئے کہ خود امریکہ میں بہت سی باپردہ مسلم عورتیں بہت اچھے طریقے سے رہ رہی ہیں۔ میرے خیال میں اس قسم کے کاموں یعنی امریکیوں کے مسلمانوں سے میل جول سے باہمی تعلقات اچھے ہوں گے اور باہمی یکجہتی کو فروغ ملے گا۔

س: بعض حضرات کی رائے میں تحریک اسلامی کو سمجھنے میں آپ یا جان اسپوزیٹو کی کوششوں کا امریکی انتظامیہ پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑا' جبکہ اس کے برعکس اسلامی تحریکوں کے خلاف چلنے والی تحریکات' جن کی نمائندگی دانیال پائپس اور برنارڈلوئس کر رہے ہیں' کے منفی اثرات پڑرہے ہیں' باہمی خیر سگالی اور افہام و تفہیم کا مشرق میں تو بہت شور ہے' مگر مغرب میں اس کا کوئی قابل ذکر اثر مرتب نہیں ہو رہا۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: یہ بات تو خود دانیال پائپس بھی نہیں کہتا' اس لئے کہ وہ اپنی تقاریر میں ہمارے بارے میں بہت کچھ کہتا رہتا ہے۔ اس نے محترم جان اسپوزیٹو کی کتابوں کو امریکی ذہنیت کے لیے ایک خطرہ قرار دیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمارا اثر امریکی معاشرے پر ضرور پڑ رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب خرطوم سے غیر ملکی سفیر واپس ہوئے تو اس پر امریکی ذرائع ابلاغ نے کہا کہ مغربی نقطۂ نظر میں یکسانیت نہیں ہے اور اس بارے میں مغربی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے' یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جیمس بیسکاٹوری جیسے حضرات کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ یہ لوگ امریکی انتظامیہ سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں' حالانکہ ماضی میں ایسا نہیں ہوا۔ اگر آپ اسپوزیٹو کی کتاب "اسلام - ایک سیدھا راستہ" کی بک اسٹالوں پر فروخت دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی سیل بہت زیادہ ہے۔ یہ کتاب یونیورسٹیوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب اسلام اور اسلامی بیداری کو سمجھنے کے لیے یونیورسٹی کے نصاب کا ایک حصہ ہے۔

مگر افسوس کہ مسلمان ہماری اس مہم میں ہماری مدد نہیں کرتے۔ وہ امریکہ میں انٹرنیٹ پر بھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسپوزیٹو ایک خبیث کردار ادا کر رہا ہے۔ بعض مسلمان مجھ پر یہ تہمت لگانے سے بھی نہیں چوکتے کہ میں ان کے بقول امریکی اسلام کو فروغ دے رہا ہوں۔ میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں مسلمانوں اور امریکہ میں مکالمہ کے لیے کوشاں رہتا ہوں۔

بہرحال رکاوٹیں اور مشکلات بہت ہیں' مگر اب مسائل کے حل کا وقت آن پہنچا ہے۔ مگر کیا کریں کہ خود کچھ کوتاہ بین مسلمان ہی ہماری ان مشکلات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہم اسلامی معاملات و مسائل کے بارے میں اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن پر رکھنے پر مجبور ہیں۔ کئی مسلمان

کرم فرما نہ ہماری مدد کرتے ہیں اور نہ ہماری مدافعت ہی کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں۔

س: بہت سے مسلمانوں کے لیے یہ بات ایک سربستہ راز ہے کہ امریکی حتمی فیصلہ کون کرتا ہے؟ اور پھر اسے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں کون نافذ کرتا ہے؟ وائٹ ہاؤس' کانگرس یا لابیاں؟

ج: امریکہ سے باہر رہنے والوں کے لیے واقعی یہ ایک مسئلہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امریکی فیصلہ کوئی مخصوص اتھارٹی کرتی ہے' مگر اصل صورت حال یہ ہے کہ حتمی فیصلے سے پہلے کئی مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ امریکہ میں مختلف حلقے ہیں' ہر ایک کی اپنی اپنی رائے ہوتی ہے۔ وہ اپنے اپنے مفادات کے اسیر ہوتے ہیں۔ اصولی طور پر تو فیصلہ ایوان صدر (وائٹ ہاؤس) سے صادر ہوتا ہے' مگر فیصلہ وہاں کیا نہیں جاتا' لہٰذا مشرق وسطیٰ کے بارے میں خارجہ پالیسی بہت سے پالیسی ساز حضرات اور اداروں کی آراء کی عکاسی کرتی ہے۔ خواہ وہ ڈیموکریٹ ہوں یا ری پبلکن۔ --- یہ سب بنیادی طور پر داخلی سیاست سے وابستہ ہوتے ہیں۔

بہت سے عناصر ہیں جو امریکہ کے حتمی فیصلہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب یہ امریکی صدر کی صوابدید پر ہے کہ وہ حالات کے پیش نظر کچھ پالیسیوں کے اثرات قبول کرے اور کچھ پالیسیوں سے صرف نظر کرے۔ امریکی صدر یہ سب کچھ امریکہ کے دیگر ممالک کے ساتھ تاریخی تعلقات کے پس منظر میں کرتا ہے' مثلاً امریکہ نے سابق برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کی کچھ پالیسیوں سے چشم پوشی کرلی' مگر جب بالکل اسی قسم کی پالیسی فرانسیسی صدر ڈیگال نے اختیار کی تھی تو امریکہ نے اس کو رعایت دینے سے انکار کردیا' اس لیے کہ امریکہ کے برطانیہ سے تعلقات' فرانس کے مقابلے میں بہت اچھے ہیں۔

مسلمان بھی اگر چاہیں تو مغرب کے ساتھ اپنے تعلقات کے ذریعے امریکی منصوبوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں' مگر افسوس کہ سیاسی اثراندازی کے میدان سے مسلمان زیادہ تر اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں' لہٰذا بات یہودی سازش کی نہیں ہے جیسا کہ بہت سے مسلمان سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہودی امریکی سوسائٹی میں مدغم ہو چکے ہیں اور انہوں نے امریکہ سے مضبوط تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔

س: سموئیل ہنٹنگٹن کا نظریہ "تہذیبوں کا تصادم" کہاں تک پہنچا ہے؟ کیا یہ ابھی تک امریکہ میں موثر ہے یا یہ فوکایوما کے نظریہ کی طرح تاریخ کے پلیٹ فارم سے پٹ چکا ہے؟

ج: یہ نظریہ ابھی تک خاصا موثر ہے' اور یہ اب بھی امریکی حتمی فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے' تاہم اب اس کی مخالفت میں کافی نظریات و آراء سامنے آچکے ہیں۔ اب ایک تبدیلی آچکی ہے۔

اس سے پہلے جو ۳۰ سال اس طرح گزرے تھے کہ نہ کسی نے امریکہ میں اسلامی تحریکوں کا دفاع کیا اور نہ کسی نے ہانٹنگٹن کے نظریہ "تہذیبی تصادم" پر تنقید کی، مگر اب یہ صورت حال کافی حد تک بدل چکی ہے۔

مگر میں پھر عرض کروں گا، کہ مسئلہ صرف اتنا نہیں کہ مغرب میں کچھ مخالف قوتیں ہانٹنگٹن کے نظریہ کی حامی ہیں، بلکہ اسلامی تحریکوں میں کچھ ایسے انتہا پسند افراد داخل ہونے میں کامیاب ہو چکے ہیں جو مغرب کے ساتھ افہام و تفہیم پر راضی نہیں۔ وہ ان دونوں کو الگ الگ ہی سمجھتے ہیں۔ اس طرح یہ مسلمان بظاہر مخالفت کر رہے ہیں، لیکن عملاً شعوری طور پر ہانٹنگٹن کے نظریے کا پرچار کر رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام میں کچھ مشترکہ انسانی قدریں موجود ہیں، ہم سب اولادِ آدم ہیں، ہم ہمیشہ نہ تصادم میں رہے ہیں اور نہ رہ سکتے ہیں۔

س: کچھ مسلمان کہتے ہیں کہ اسرائیل امریکہ پر حاوی ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ یہودی امریکہ میں بہت بڑا سیاسی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کا یہ کردار اس لیے دور رس ہے کہ وہ امریکی معاشرے کے تمام اہم میدانوں میں سرگرم عمل ہیں۔ مثلاً" اگر کوئی شخص کسی اخبار میں یہودیوں کے خلاف ایک مضمون لکھتا ہے تو دسیوں یہودی اس کی وضاحت و صفائی پیش کرتے ہیں اور اس کے خلاف تردیدی مضمون لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے، اس کے لیے وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے جو وہ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ کہنا کہ یہودی امریکہ پر حکومت کر رہے ہیں، محض ایک بہانہ ہے اور مسلمانوں کی طرف سے اپنی بے عملی اور کچھ نہ کرسکنے کی حالت کے جواز کا ایک عذرلنگ ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں ساٹھ کے عشرے میں اپنے طلبہ کو عرب - اسرائیل تصادم کا مضمون پڑھایا کرتا تھا تو میں نے عرب اور اسرائیلی مراکز کو لکھا کہ وہ مجھے اس علاقے کے بارے میں ہر طرح کی معلومات سے نوازیں۔ اس کے جواب میں میرے پاس کئی اسرائیلی مراکز سے رپورٹیں آئیں، مگر عرب ممالک کے کسی ایک مرکز نے بھی مجھے کسی نوعیت کی اطلاعات بہم نہ پہنچائیں۔ عرب سفارت خانوں کا بھی یہی وطیرہ رہا۔

میں نے جب بھی کسی عرب ملک کے سفارت خانے سے رابطہ قائم کرکے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے سفیر محترم کو یہاں تشریف لانے کے لیے کہیں تاکہ وہ طلبہ سے اسرائیل کے ساتھ تصادم کے موضوع پر گفتگو کریں تو کسی ایک صاحب نے بھی آنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی، مگر

اس کے برعکس اس میدان میں یہودی یا اسرائیل بہت مستعد ثابت ہوئے۔

س: مشرق وسطیٰ میں اسلامی تحریکوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہیں؟

ج: مجھے قوی توقع ہے کہ نوے کی دہائی ایک نئی نسل کو پیش کررہی ہے' نژادِ نو جو جدید افکار سے مالامال ہے۔ یہ آج کے مسلم معاشروں میں مسلمانوں کی قوت' حرکت اور زندگی کا ثبوت ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج سے سو سال پہلے مفتی محمد عبدہ اسلامی اصولوں کی تشکیل جدید کے لیے مصروف عمل تھے' مگر ان کا تعلق بہرحال انیسویں صدی سے تھا' بلکہ یہ پہلی عالمی جنگ کے وقت کی بات ہے۔ اس کے بعد ایک نئی نسل آئی جس میں شیخ حسن البنا جیسے حضرات تھے۔ ان مردان کار نے محمد عبدہ کے پرچم کو تھاما اور اسلامی اصولوں کی تشکیل نو کے عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچا کے دم لیا۔